محسنِ انسانیت (صلی اللہ علیہ وسلم)

(مخالفتوں کے طوفان سے گذرتے ہوئے)

مدنی دور

نعیم صدیقی

(۳)

یہود کا تاریخی مقام اور پارٹ

تاریخِ اسلام وجاہلیت کی یہ عجیب ٹریجیڈی ہے کہ دینِ حق کی مزاحمت کرنے کی خدمت سب سے بڑھ کر "جوشِ ایمانی" کے ساتھ ہمیشہ اہلِ مذہب ہی نے سرانجام دی ہے۔ اہلِ مذہب جن کو دینِ حق کی دعوت کی پہلی آواز سنتے ہی اولین صفوں میں جا کھڑے ہونا چاہیے، وہی ہمیشہ "اوّل کافرِ بہ" بنتے رہے ہیں (الا ماشاء اللہ)۔ اہلِ مذہب ابتدا میں مذہب کے خادم اور علمبردار ہوتے ہیں، لیکن آہستہ آہستہ جب ان کا ایک مرتبہ پیدا ہو جاتا ہے اور ان کے کچھ مفاد مذہب سے وابستہ ہو جاتے ہیں تو پھر وہ مذہب کو اپنا تابعدار بنا لیتے ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ مذہب کے نام پر اپنے کچھ مستقل حقوق پیدا کر لیتے ہیں، پیروانِ مذہب سے وہ کچھ اپنے طبقاتی مطالبات منوا لیتے ہیں اور کچھ اعزازات ان کے لیے مخصوص ہو جاتے ہیں۔ مذہب اپنے پیرووں کے دورِ زوال میں ہمیشہ انہی مراحل سے دوچار ہوتا ہے۔ یہاں پہنچ کر مذہب ایک اچھے نفع بخش کاروبار کی سطح پر آجاتا ہے اور وہ ایک موروثی جاگیر بنتا ہے۔ یہاں پہنچ کر وعظ مالِ تجارت بن جاتے ہیں، علم ذریعہ معاش ٹھہرتا ہے، فتوے متاعِ بازار بن کر اپنا ایک مارکیٹ ریٹ پیدا کر لیتے ہیں، دینی مناصب روحانی قیادت واقتدار کا زینہ قرار پاتے ہیں۔ اس مقام پر جب ایک بار اہلِ مذہب آ پہنچتے ہیں تو پھر ان کا کاروباری ذہن ہر معاملے میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ہمارا مفاد محفوظ رہتا ہے یا نہیں، اور ہمارا منصب اور

اور ہماری پوزیشن کسی اور طرف تو منتقل نہیں ہوتی جاتی۔ کاروباری ذہن جب ان اوصاف کے ساتھ دائرۂ مذہب میں آگھستا ہے تو اہل مذہب :

— کسی کی طرف سے اختلاف کو گوارا نہیں کر سکتے اور نہ کسی بڑے مقصد کے لیے دوسروں کے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں۔

— اپنے اندر کسی کمزوری یا غلطی کو ماننے اور اس کی اصلاح کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔

— قیادت واثر کی کرسی چھوڑ کر کسی دوسرے کی دعوت پر ادائے فرض نہیں کر سکتے۔

ٹھیک یہی مقام تھا جس کی آخری سرحد پر یہود آ پہنچے تھے۔ وہ یہ ہرگز نہیں مان سکتے تھے کہ حق ان کے گروہی دائرہ کے باہر بھی پایا جا سکتا ہے، وہ نہیں مان سکتے تھے کہ ان کے پیچھے لگ کر چلے بغیر بھی کوئی راہ یاب ہو سکتا ہے، وہ نہیں مان سکتے تھے کہ رہنمائی کا منصب کسی دوسرے کو بھی مل سکتا ہے۔

مخالفت قریش مکہ نے بھی کی اور مخالفت یہود نے بھی کی اور دونوں میں سے کسی نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی مگر دونوں کے مخالفانہ پارٹ میں بڑا بھاری فرق ہے۔ جب ہم تجزیہ و موازنہ کر کے دیکھتے ہیں تو اولین حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ قریش مکہ کی مخالفت میں اصل کارفرما روح جذبۂ استکبار کی تھی، لیکن یہود پر حسد کا جذبہ چھایا ہوا تھا۔ وہاں احساسِ برتری کی بیماری تھی اور یہاں احساسِ کمتری کا روگ تھا۔ اسی لیے وہاں کھلا کھلا انکار اور تصادم تھا اور یہاں مکاری اور عیاری کا مزاج مخالفانہ سرگرمیوں میں نمایاں تھا۔ وہاں بہادرانہ جسارت تھی اور یہاں بزدلانہ شرارت! وہاں مخالفت سیدھی تشدد کے رخ پر ارتقا کرتی رہی تھی، لیکن یہاں وہ نجویٰ اور سازش اور نفاق کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ مکہ میں صرف مسلم اور کافر دو گروہ تھے لیکن مدینہ میں مسلم اور کافر طاقتوں کے بیچ میں ایک تیسرا کردار نفاق کا بھی نمودار ہو گیا۔ اس مطالعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جامد مذہبیت اور فاسد دین داری کھلے کھلے کفر و شرک اور صریح جاہلیت سے زیادہ پست فطرت رکھتی ہے اور مخالفتِ حق میں زیادہ گھٹیا کردار پیش کرتی ہے۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ اس رزمِ کفر و دین میں یہود کی جامد مذہبیت اور فاسد دین داری نے اسلام کے مقابلے پر کفر و شرک کی طاقت کے پلڑے میں اپنا پورا پورا وزنِ تعاون ڈال دیا، حالانکہ بڑے سے

بڑے اختلاف کے باوجود اسے خدا پرستانہ و اخلاق پسندانہ مسلک کے علمبرداروں کے ساتھ زیادہ ہمدردیاں ہونی چاہئیں تھیں۔ زیادہ سے زیادہ گنجائش اس بات کی ہو سکتی تھی کہ یہود مخالفتِ اسلام میں اپنی پوزیشن کفار و مشرکین سے بالکل الگ اور ممیز رکھتے۔ لیکن "تعالوا الی کلمۃٍ سواءٍ بیننا وبینکم" کی دردمندانہ پکار سننے کے باوجود انھوں نے انسانِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے ساتھیوں کے پاکیزہ دینی افکار و اعمال کو چھوڑ کر ابوجہل اور ابولہب جیسے گھٹیا انسانوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا اور جامد مذہبیت اور فاسد دینداری کا یہ بھی ہمیشہ تاریخی رول رہا ہے کہ وہ معرکہ کارزار میں دینی محاذ پر کسی قیمت کے عوض بھی اپنا تعاون پیش نہیں کر سکتی بلکہ لازماً وہ دین کی دشمن طاقتوں کی گود میں جا گرتی ہے۔ اس کا قارورہ ہمیشہ کفر و الحاد اور فسق و فجور کے پیکروں سے ملتا ہے۔ یہاں گفتگو چند مستثنیٰ افراد پر نہیں ہو رہی جو کسی گروہ کے اندر سے بدترین دورِ فساد میں بھی برآمد ہوتے ہیں۔ ہم عمومی کلیہ اخذ کر رہے ہیں۔

یہ تھا موقف جو یہود نے لیا! وہ اپنی کمین گاہوں سے نکلے اور علم و تقویٰ کے سارے ہتھیار سنبھال کر تخریب پسندانہ منفیت کے مورچوں پر جا ڈٹے اور انھوں نے کھلا کفار و مشرکین کو اپنا پورا پورا تعاون پیش کر دیا۔ انھوں نے داعیِ حق اور تحریکِ اسلامی اور اس کے کارکنوں کے خلاف پھبتیاں کسیں، مذاق اڑائے، نت نئے سوالات اور اعتراضات گھڑ گھڑ کر کٹ حجتیاں کیں، الزامات لگائے، پروپیگنڈے کے طوفان اٹھائے، مخبریاں اور جاسوسیاں کیں، مسلمانوں کو باہم دگر لڑانے کے منصوبے اختیار کیے، تکفیر و تفسیق کے فتوے لگائے۔ رحمتِ دو عالم کے قتل کی تدبیریں کیں اور جنگ اور امیر جنبی کے حالات میں سخت قسم کی غداریاں کیں۔ اپنی طرف سے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا۔ لیکن شروع سے آخر تک یہ ایک بڑے مغالطے میں رہے ــــ اور منفی مزاج کی تخریبی مہموں کو اٹھانے والی طاقتیں ہمیشہ اس مغالطے میں رہتی ہیں (لیکن بعد والوں کو ان سے سبق لینے کی بھی توفیق نہیں ہوتی) ــــ کہ کسی اصولی اور تعمیری تحریک کا توڑ ایسے لوگ کامیابی سے کر سکتے ہیں جو خود بے اصول ہوں، کوئی تعمیری نقشہ نہ رکھتے ہوں اور جو اخلاقی پستی کی آخری گہرائیوں میں جا گرے ہوں۔ درحقیقت ایسے لوگوں کا پارٹ بالکل اس نوعیت کا ہوتا ہے جیسے چڑھتے سورج کی شعاع اُفگنی سے چڑ کر چمگادڑ فضا میں اپنے پر پھیلا کر زمانے کو تاریک رکھنے کے

درپے ہوں، جیسے شہسواروں کے کسی دستے کا راستہ روکنے کے لیے چند مچھر اور چند مکھیاں اپنی بھنبھناہٹ کا پورا زور شور دکھادیں، جیسے چودھویں کے چاند کو دیکھ کر کوئی گنوار اس کی طرف منہ اٹھا کر تھوک دے۔

جن لوگوں میں خود اپنی کوئی قدر وقیمت باقی نہ رہی ہو، جن کے پاس کوئی جاندار پیغام موجود نہ ہو جن کا اخلاق و کردار زمانے کے لیے کوئی جاذبیت نہ رکھتا ہو اور جن سے کسی تعمیری خدمت کی توقع انسانیت کو نہ رہی ہو، وہ محض دوسروں کا راستہ روک کر اور ان کا منہ چڑا کر اپنا کوئی مقام نہیں بنا سکتے۔ جن کے پاس جمود اور فساد اور بگاڑ اور تخریب کے سوا اور کوئی متاعِ حیات باقی نہ رہی ہو وہ اصلاحی و تعمیری کام کرنے والی کسی متحرک طاقت کے منہ آکر اپنے اندر قدر وقیمت پیدا نہیں کر سکتے۔ انجام کار لیسوں کے حصے میں ذلت و نامرادی کے سوا اور کچھ نہیں آتا مگر جب جذباتی ردِ عمل کی رو میں بہہ کر کوئی فاسد طاقت اندھی ہو جاتی ہے تو پھر وہ انجام کو نہیں سوچتی، بس آگے ہی آگے بڑھتی جاتی ہے۔ یہود کی فاسد طاقت بھی احساسِ کہتری اور حسد کے مارے اندھی ہو کر اسلام سے الجھنے لگی۔

یہود کا کردار مسلمانوں کے کردار کے بالمقابل رکھ کر دیکھنے سے ایک نتیجہ یہ بھی اخذ ہوتا ہے کہ سچائی کے کسی علمبردار کی صدا پر لبیک کہنے والوں کا اخلاق جتنا بلند ہوتا جاتا ہے اس کی مخالفت کرنے والوں کی سیرتوں میں اتنا ہی زوال پیدا ہوتا جاتا ہے، مثبت تحریک اپنے دائرہ میں انسانیت کو جتنا زیادہ سنوارتی ہے منفی ردِ عمل اپنے حلقہ میں اتنا ہی زیادہ فساد اور بگاڑ پیدا کرتا چلا جاتا ہے

اسلامی معاشرہ کے سربراہ کار کے سامنے ایک طرف بڑا وسیع اور متعدد پہلو رکھنے والا تعمیری منصوبہ تھا، دوسری طرف مسلسل آنے والے مہاجرین کی بحالی اور ان کو معاشی سہارا بہم پہنچانے کا پرابلم تھا تیسری طرف قریشِ مکہ کی طرف سے ہر لحظہ حملے کا امکان تھا اور اس کے لیے دفاعی استحکام کی ضرورت تھی؛ اور ان ساری مشکلوں میں اضافہ کرنے والی بڑی مشکل یہ تھی کہ مدینہ کی نوخیز ریاست اور زیرِ تشکیل معاشرہ کے اپنے دائرے میں غداروں اور سازشیوں کی ایک بڑی بھاری تعداد فتنہ انگیزیاں کر رہی تھی۔ غور کرو کہ سرورِ عالمؐ کی ذمہ داریاں کتنی نازک اور پیچیدہ ہو گئی ہوں گی۔ خیال میں لاؤ کہ ایک جان کتنی گوناگوں الجھنوں میں دن رات الجھی رہتی ہوگی۔ اندازہ کرو کہ چھوٹی سی اسلامی جماعت اور ابتدائی مراحل سے گزرتی ہوئی

تحریک کیسے جان جوکھم میں پڑی ہوگی۔ اور اس ساری صورتِ حال کو پیدا کرنے کا سہرا تاریخ میں یہود کے سر بندھا نظر آتا ہے — جی ہاں! ایک خدا کو ماننے والوں، ابراہیم اور موسیٰ علیہ السلام کے پیرواؤں، تورات کے علمبرداروں اور علم و تفقہ اور تقدس و تقویٰ کے ٹھیکیداروں کے سر!

"ہوئے تم دوست جس کے اس کا دشمن آسماں کیوں ہو"

ابتدا میں یہود کو حضور سرورِ عالمؐ اور اسلام سے بڑی اچھی امیدیں تھیں۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ نئی طاقت انہی کی طرح بنو اسمٰعیل سے برسرِ اختلاف ہے یہود جن انبیا کے نام لیوا تھے ان کو مانتی ہے ان کی کتاب کا احترام کرتی ہے اور انہی کے مرکزِ عبادت، یعنی بیت المقدس کو اپنا قبلہ بنائے ہوئے ہے بنا بریں ان کا اندازہ یہ تھا کہ آہستہ آہستہ ہم محمد رسول اللہ اور آپؐ کے رفقا کو اپنے اندر جذب کر لے جائیں گے۔ یہود کا ذہن حق پرستانہ طرز پر نہیں سوچ رہا تھا، بلکہ یہ خالص سوداگرانہ طرزِ فکر تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ یہ اجڑے پجڑے لوگ، جو سینکڑوں کی تعداد میں یوں اکھڑے چلے آ رہے ہیں، ان کو ہم اپنے باڑے کی بھیڑیں بنا سکیں گے، اسی امید پر انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ بغیر کسی لمبی چوڑی ردوکد کے معاہدات استوار کر لیے اور اُس سیاسی تنظیم کو گوارا کر لیا جو مدینہ میں قائم کی جا رہی تھی۔ ان کا اندازہ یہ تھا کہ یہ سیاسی طاقت جو اپنی کونپلیں نکال رہی ہے، یہ تو بس ہماری جیب میں ہے۔ ہماری پیری اور مشیخت کی گدیاں اس کو چار جانب سے احاطہ کیے ہوئے ہیں اور ہمارے علم و تقویٰ کی ساکھ اپنا دامن اس کے اوپر پھیلائے ہوئے ہے۔ کوئی سوال نہ تھا حق و صداقت تک رسائی حاصل کرنے کا، کوئی کاوش نہ تھی فکر و کردار کو سنوارنے کی، کوئی اہتمام نہ تھا عاقبت بنانے کا! مجرد ایک گروہی مفاد کی سیاست تھی جو ان کم بختوں کے سر پر سوار تھی۔ ان کے نزدیک تو گویا مدینہ کے ماحول میں ان کے گھر کے دروازوں پر شکار آ آ کر جمع ہو رہا تھا اور وہ اپنے دام و فتراک تیار کیے گھات میں بیٹھے تھے۔ ان کی نگاہ میں گویا مچھلیاں تھیں جو غول در غول ساحل کے پاس آ رہی تھیں اور یہ ماہی گیر کھلی ہوئی یا چھپی کے ساتھ مذہبی مکاری کی ڈوریاں اور کنڈیاں پانی میں ڈال رہے تھے۔ مگر کچھ ہی مدت کے تجربے سے ان کی خوش فہمیوں کا خاتمہ ہونے لگا۔ انہیں اسلامی جماعت نے جتا دیا کہ یہ کوئی سستا شکار نہیں ہے' یہ

ایسی مضبوط طاقت ہے کہ شکاری اس کے ہاتھوں خود شکار ہو کے رہ جانے والے ہیں۔ ان کی نگاہوں کے سامنے آہستہ آہستہ ایک انقلابی مزاج کی ریاست پروان چڑھنے لگی اور یہ ریاست اپنے وجود میں ایک قلعے کی طرح مضبوط بنتی گئی، یہود کو چندہی دن میں معلوم ہوگیا کہ یہ ریاست جس کے بنانے میں دستوری معاہدہ کی بنا پر وہ خود بھی حصہ دار ہیں ان کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی نہیں بن سکتی؟ ورنہ اس میں انگلی دھنسانے کی ان کو کوئی جگہ مل سکتی ہے۔ انھوں نے اپنے لیے جو مقام سیادت اس میں حاصل کرنا چاہا اس کے بارے میں ان کو جلدی ہی نامرادی کا سامنا کرنا پڑا، اس کے مختلف اداروں اور سرگرمیوں میں انھوں نے نفوذ اور تصرف حاصل کرنے کی جو کوششیں کیں، ان میں بار بار منہ کی کھائی، اس ریاست کے صدر اور کارپردازوں اور اس کے اصولوں پر ایمان رکھنے والے شہریوں کو انھوں نے ہاتھ میں لینے کے جتنے بھی منصوبے اختیار کئے وہ سب ناکامی کا شکار ہو گئے، الٹا اولین مراحل میں یہ ہوا کہ یہود کے اپنے آدمیوں نے محسن انسانیت کی پیش کردہ صداقتوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا شروع کر دیا۔ یہ "خطرناک" انقلابی رَو عامیوں ہی کو نہیں، اُن کی بعض سرکردہ ہستیوں کو بھی بہالے گئی۔ تب ان کی آنکھیں کھلیں۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ان کا سارا بازارِ تقدس اجڑ جانے والا ہے، اور ان کے باڑے کی بھیڑیں ایک ایک کر کے ہاتھ سے جانے والی ہیں۔ یہ سودا یہود کو بڑا مہنگا پڑا۔ ایک طرف وہ بروئے معاہدہ مسلم ریاست کے نظام کے پابند ہو چکے تھے، دوسری طرف مسلمانوں کے ساتھ دفاعی مقصد کے لیے حلیفانہ معاہدات استوار کر چکے تھے اور تیسری طرف وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ سب کچھ جس مقصد کے لیے کیا گیا تھا وہ غارت ہوا جا رہا ہے، چنانچہ اندر ہی اندر ان میں ایک حاسدانہ ابال پیدا ہونے لگا اور وقتاً فوقتاً یہ گندا مادہ ان کے اجتماعی بدن کے ناسوروں سے بہنے لگا۔ خصوصاً تحویلِ قبلہ پر تو یہ جذباتی پیپ یہودی سوسائٹی کے مسام مسام سے رسنے لگی! اس جذبہ نے اوّلاً شر انگیزی کا راستہ اختیار کیا، پھر یہ تخریبی کارروائیوں کی شکل میں ڈھلا، حتیٰ کہ مرتبۂ کمال تک پہنچ کر اس نے غداری کی صورت اختیار کر لی۔ آئیے ہم مدنی دَور میں اس جذبہ کے ردِ عمل سے پیدا ہونے والی ان مخالفانہ سرگرمیوں کا ایک جائزہ لیں جس سے انسانیت کا سب سے بڑا خیر خواہ اور اس کے ساتھی دو چار ہوئے اور جس سے اپنا وجود سلامتی کے ساتھ

بچا نکالنے کے لیے اسلامی ریاست کو سخت مشقتیں اٹھانی پڑیں۔

کھچاؤ مدینہ کی نوخیز اسلامی جماعت جن بھاری ذمہ داریوں میں گھری ہوئی تھی ان کے لحاظ سے اس کے ایک ایک فرد کی زندگی بڑی قیمتی تھی اور ایک ایک کارکن کا پارٹ بڑا اہم تھا۔ علی الخصوص جو لوگ صفِ اوّل کے کارکن تھے ان میں سے کسی ایک کی کمی بھی سرورِ عالم اور آپ کے رفقا کے لیے بڑا بھاری حادثہ تھی ابوامامہ اسعد بن زرارہ جو بنو نجار پر نقیب مقرر کیے گئے تھے، ایسا ہی اہم مقام رکھتے تھے۔ بالکل ابتدائی دور میں ان کو عالمِ آخرت سے بلاوا آ گیا اور ایک جلیل القدر سپاہی تحریک اسلامی کی صفوں میں سے کم ہو گیا۔ حضورؐ کے لیے یہ صدمہ فی نفسہٖ بڑا صدمہ تھا، لیکن اس صدمہ کو مدینہ کی اسلام دشمن طاقت نے اپنے مفسدانہ پروپیگنڈے کے ذریعے دگنا کر دیا۔ یہود اور ان کا ساتھ دینے والے منافقین یہ کہتے پھرتے تھے کہ اجی کیا ہے، اگر یہ محمدؐ کوئی سچا نبی ہوتا تو اس کا ایسا سرگرم ساتھی ایسے عالم میں کیوں مرا ہوتا۔ گویا مخالفین کے ہاں اس موت پر گھی کے چراغ جل گئے۔ وہ قلبِ حساس جو چاروں طرف سے دکھوں کے تیروں کی زد پر تھا، وہ بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ بئس المیّت ابوامامة! یھود ومنافقی العرب یقولون لو کان نبیاً لم یمت صاحبه ولا املک لنفسی ولا لصاحبی من اللہ شیئاً[1]۔ اس چھوٹے سے واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دشمنوں کے دلوں کے پھوڑے کیسے پکے ہوئے تھے۔ بنو نجار نے آکر حضورؐ سے درخواست کی کہ اب ہمارے لیے کوئی اور نقیب مامور فرما دیجیے۔ بنو نجار کی تسکین کے لیے آپ نے خود اپنے آپ ہی کو بربنائے قرابت ان کا نقیب قرار دیا۔" انتم اخوالی وانا بما فیکم، وانا نقیبکم"!

یہود نے جن شرائط پر دستوری معاہدہ پر دستخط ثبت کیے تھے، ان کی وجہ سے وہ اس پر قادر نہ تھے کہ تحریک اسلامی کو روز افزوں ترقی سے روک سکیں۔ ان کی ناک کے نیچے عامۃ الناس اور ان کے سربراہ کار اسلام کے جھنڈے کی طرف لپک رہے تھے اور ان کی گدیاں اور پیریاں، ان کی

---

[1] سیرت ابن ہشام ج۔ ا صفحہ ۱۵۳ "برا ہوا ابوامامہ کا مرنا۔ یہود اور منافقین عرب کہتے ہیں کہ اگر یہ شخص نبی ہوتا تو اس کا ساتھی نہ مرتا، حالانکہ اللہ کی مشیت سے نہ میں خود بچ سکتا ہوں نہ اپنے کسی ساتھی کو بچا سکتا ہوں"

خانقاہیں اور دارالافتاء دم سادھے یہ دوررس انقلاب واقع ہوتے دیکھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ تحریکِ حق کی لہریں ان کے گھروں کے دروازوں سے داخل ہونے لگیں۔ اور کاروباری مذہبیت کے صبر کا پیمانہ اس حادثہ کے پیش آجانے پر لازماً چھلک جاتا ہے کہ اُس کے اپنے حلقے کے افراد ــــ بالخصوص نمایاں اور قیمتی افراد ــــ ٹوٹنے لگیں۔ دوسری طرف ہر انقلابی تحریک کی قوتِ نفوذ ہوتی ہی اس بلا کی ہے کہ منفی رجحان کے ساتھ جو لوگ اس کے مقابلے پر آئے ہیں وہ خود انہی کے گھروں سے نوجوان طاقت کو اٹھا کر ان کے مقابلے میں لے آتی ہے۔ بیٹے باپوں سے، بہویں خسروں سے، بیٹیاں ماؤں سے، پوتے دادوں سے، غلام آقاؤں سے اختلاف کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ بوڑھی مذہبیت جب نوجوان تحریکیت کے اس داخلی حملے سے دوچار ہوجاتی ہے تو وہ مغلوب الغضب ہوجاتی ہے۔ یہاں پہنچ کر اس کے صبر و تحمل کا قطعی خاتمہ ہوجاتا ہے۔ مدینہ میں بھی تاریخ نے اپنا ہی معمول دوہرادیا۔ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ کس زور شور سے سچائی کا بول بالا ہورہا تھا اور کس تیز رفتاری سے گھر گھر نئے نظام کا ڈنکا بج رہا تھا۔ اس تغیرِ احوال کو دیکھ کر یہود کے سینوں پر سانپ لوٹ لوٹ جاتے تھے۔ خصوصاً جب قبائل کے سردار اور شہرت یافتہ با اثر شخصیتیں اسلام کی فطری پکار پر لبیک کہتی تھیں تو حسد اور احساسِ کہتری کی وجہ سے پورے یہودی معاشرے کے بدن پر کپکپی طاری ہوجاتی تھی۔ مثلاً ان کے دیکھتے دیکھتے جس دن ابوقیس بن ابی انس نے کلمۂ حق کو سینے میں جگہ دی ہوگی اس دن یہودیت کے سینے میں کیا کیا اُبال نہ اٹھے ہوں گے۔ یہ ایک نامور بزرگ تھے۔ دورِ جاہلیت ہی میں طبیعت پلٹا کھا گئی تھی۔ محض فطرت کی رہنمائی سے بُت پرستی چھوڑ دی، غسلِ جنابت کو لازم ٹھہرالیا، حائضہ عورتوں سے پرہیز اختیار کیا، پہلے نصرانیت کی طرف مائل ہوئے مگر ٹھٹک گئے، اپنے گھر میں مسجد بنائی جس میں ناپاکی کی حالت میں داخل ہونے سے اجتناب رکھا، کہتے تھے کہ میں ابراہیمؑ کے رب کی بندگی و غلامی کرتا ہوں۔ یہ بزرگ ضعیف العمر تھے۔ حق بات کہنے میں بہت جرأت دکھانے والے اور جاہلیت میں اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اعلان کرنے والے تھے۔ اپنے دلی جذبات کو شعر کا قالب دیا، چند اشعار کتابوں میں منقول ہیں۔ ایسے ذہین اور نیک سیرت بزرگ کا مقام خاصا نمایاں ہونا ہی چاہیے

کیا بعید کہ یہود کی ان سے بحثیں رہتی ہوں اور انھوں نے ان بزرگ کو اپنی طرف کھینچنے کی کوششیں صرف کی ہوں۔ لیکن اس شخص کی فطرتِ صالحہ نے دینِ حق کا جو ذوق پیدا کر دیا تھا وہ بجز داعیٔ اسلام کے کسی سے تسکین نہ پا سکا۔ حضورؐ مدینہ پہنچے تو قسمت کے جاگ اٹھنے کی گھڑی آگئی اور یہ بزرگ حلقۂ تحریک میں شامل ہو گئے اور بہترین طریق سے اسلام پر عمل پیرا ہو گئے۔ اس واقعہ سے یہود میں جو ردّ عمل ہوا ہوگا اس کا کچھ نہ کچھ اندازہ قوتِ تصور کے بل پر کیا جا سکتا ہے۔

لیکن یہاں تک تو خیر پھر بھی جو کچھ ہوا بیرونِ در ہوا، سنگین حوادث تو وہ تھے جو تحریک کے درونِ خانہ گھس آنے پر رونما ہوئے۔ ان میں سے یہود کے ذہنی توازن کو بالکل تلپٹ کر دینے والا واقعہ ان کے ایک جلیل القدر عالم کا ذہنی انقلاب تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ اکابر — چاہے وہ اہل دنیا ہوں یا اہلِ مذہب — میں قبولِ حق کی صلاحیتوں کا تناسب بہت کم ہوتا ہے لیکن ہر دائرے میں فطرتِ صالحہ رکھنے والے افراد ضرور موجود ہوتے ہیں اور وہ خورشیدِ صداقت کے جلوہ آرا ہو جانے پر آنکھیں موند کر تعصب کے غاروں میں جا نہیں چھپتے بلکہ سنہری اور روپہلی شعاعوں کے لیے دل اور دماغ کے دریچے کھول دیتے ہیں۔ ان صفوں سے اگرچہ کم لوگ آتے ہیں، مگر جو آتے ہیں وہ بڑی چیز ہوتے ہیں کیونکہ ان کو مفاد اور مناصب کی بڑی بھاری زنجیریں اور بیڑیاں توڑ کر آنا ہوتا ہے — یہود کی صفوں میں ایسے ہی ایک بزرگ عبداللہ ابن سلام تھے۔ قبل اسلام ان کا نام حصین تھا۔ یہ بلند پایہ عالم، متقی تھے اور مذہبی لیڈر رہے۔ ان کا تعلق بنی قینقاع سے تھا۔ حضورؐ سے ملاقات کے بعد انھوں نے اسلام قبول کر لیا اور اپنے گھر والوں کو بھی دعوت دی اور متاثر کر لیا۔ چنانچہ سب تحریکِ اسلامی کے حلقے میں داخل ہو گئے۔ ان کے قبولِ اسلام کی داستان سنیے جسے اُن سے اُن کے ایک عزیز نے روایت کیا ہے:

"میں نے جب اللہ کا پیغام لانے والی ہستی کے بارے میں سنا تو آپؐ کی صفات، آپ کے نام اور آپؐ کے زمانے کو پہچان لیا، کیونکہ ہم اس کے انتظار میں تھے۔ سو اس اطلاع پر میں دل ہی دل میں خوشی محسوس کر رہا تھا لیکن زبان سے کچھ نہیں کہتا تھا۔ تا آنکہ رسولِ خدا مدینہ آپہنچے۔ جب آپؐ قبا میں بنی عمرو بن عوف کے گھرانے میں پہنچے تو ایک شخص آیا اور اُس نے

آپؐ کی تشریف آوری کی اطلاع مجھے اس عالم میں دی کہ میں اپنے ایک کھجور کے درخت کی چوٹی پر چڑھا کام میں مصروف تھا۔ میری پھوپھی خالدہ بنت حارث نیچے بیٹھی تھیں۔ میں نے جونہی تشریف آوری کی خبر سنی، تکبیر بلند کی۔ پھوپھی نے میری تکبیر سن کر مجھ سے کہا: "خدا تجھے غارت کرے، تجھے اگر موسیٰ بن عمران کی آمد کا مژدہ بھی ملا ہوتا تو تو اس سے بڑھ کر اظہارِ مسرت نہ کرتا۔" میں نے کہا: "پھوپھی جان! خدا کی قسم! یہ موسیٰ بن عمران کے بھائی ہیں اور انہی کے دین پر کاربند ہیں، یہ وہی پیغام لائے ہیں جو موسیٰ لائے تھے۔ اس پر وہ کہنے لگیں: اے میرے برادر زادے! کیا یہ وہی نبی ہے جس کے بارے میں ہمیں بتایا جاتا ہے کہ وہ قیامت کی گھڑی کے قریب اٹھایا جائے گا؟ میں نے کہا کہ ہاں یہی تو وہ ہے۔ پھر میں خدا کا سندیسا لانے والے کی خدمت میں پہنچا اور میں نے اسلام قبول کر لیا۔ پھر اپنے گھر والوں کے پاس آیا اور ان کو بھی دعوت دی، سو وہ بھی حلقۂ اسلامی میں داخل ہو گئے۔[1] (باقی آئندہ)

---

[1] سیرت ابن ہشام۔ ج ۱ ص ۱۶۳